اداریہ

غرب شناسی(Occidentalism)

بنیاد کے گزشتہ شمارے میں ہم نے صدمے، صدماتی ادب اور نو آبادیاتی صدمے کو موضوع بنایا تھا۔ نو آبادیاتی صدمے کی وضاحت میں، ہم نے لکھا تھا کہ اس کے زیر اثر انسانی وجود، غیر وجود میں بدل جاتا ہے۔ غیر وجود، وجود کی محض نفی نہیں، بلکہ وجود کی مسخ شدہ صورت ہے۔ صرف زخم (جو بہ یک وقت صدمے کا باعث، صدمے کی زبان، اور صدمے کی یادداشت ہے) ہی وجود کو مسخ نہیں کرتا؛ وجود کی تعریف، مقام، کردار پر کسی 'غیر' قوت کا اجارہ بھی، اسے مسخ کرتا ہے۔ اٹھارھویں تا بیسویں صدی کی شرق شناسی کی روایت نے مشرق کے اجتماعی وجود کو مسخ کیا۔ اس کا مضحک خاکہ بنایا، اور اسے استعماری طاقت کو جواز بخشنے اور بڑھانے کے لیے، نہایت لطیف مگر مہلک انداز میں استعمال کیا۔ ایڈورڈ سعید نے اسی شرق شناسی کا تجزیہ کیا۔ اس نے شرق شناسی کی مغربی روایت کو میشل فوکو (Michel Foucault ۱۹۲۶ء-۱۹۸۴ء) کے کلامیے (Discourse) کے طور پر دیکھا، جس میں علم اور طاقت یک جا ہوتے ہیں۔ علم کی اپنی طاقت، استعماری مقتدرہ کے حق اور مفاد میں استعمال ہوتی ہے، اور علم کا موضوع بننے والے افراد اور معاشرے، 'وجود' نہیں سمجھے جاتے؛ ارادے، منشا، فیصلہ سازی، خود شناسی کی قوت کے حامل وجود تصور نہیں کیے جاتے، محض اشیا اور شبیہیں (images) خیال کیے جاتے ہیں، اور ان شبیہوں کی کوئی مماثلت، ان افراد سے نہیں ہوتی۔ سعید کے اس تجزیے نے، شرق شناسی کی عظیم الشان سمجھی جانے والی علمی روایت کو گویا سر کے بل گرا دیا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں، کسی اور کتاب نے اتنے مباحث پیدا نہیں کیے، جتنے شرق شناسی نے کیے۔ مابعد نو آبادیات، ردِ نو آبادیات ہی نہیں، سبالٹرن مطالعات (Subaltern Studies) کی مختلف صورتوں، بشمول تانیثیت، مقامیت، روایت کی بازیافت کے مباحث کو اس کتاب نے پیدا کیا، یا ان کی سمت اور رفتار پر اثر ڈالا۔ ان سب پر تو گفتگو مسلسل ہوتی رہتی ہے، ایک اور نظریہ جسے اس کتاب ہی سے مہمیز ملی، اس پر بہت کم گفتگو ہوئی ہے۔ غرب شناسی(Occidentalism)۔ ایک عجب آئرنی یہ ہے کہ خود سعید نے شرق شناسی کے آخری باب میں صاف لکھا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ میں اپنے قاری کو یقین دلانے میں کامیاب ہوا ہوں کہ شرق شناسی کا جواب غرب شناسی نہیں ہے"۔ یعنی جو کچھ مغرب نے مشرق کے ساتھ کیا ہے، مشرق کو جواب میں وہی کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ سعید کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کا جائزہ ہم آخر میں لیں گے، یہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کچھ مفکرین نے سعید کی تنبیہ کا خیال نہیں کیا، اور شرق شناسی کا جواب، غرب شناسی ہی میں دیکھا۔ اس بار اداریے کا موضوع ہم اسی غرب شناسی کو

بنانا چاہتے ہیں۔

مریم ویبسٹر لغت کے مطابق، غرب شناسی کی اصطلاح پہلی بار ۱۸۳۹ء میں استعمال ہوئی، جس کا مطلب "مغربی لوگوں اور مغربی ثقافت کے مخصوص اوصاف" تھا (جب کہ لفظ occident چودھویں صدی سے، مغرب کے مفہوم میں، استعمال میں تھا)، مگر غرب شناسی کی اصطلاح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اس پر باقاعدہ علمی مباحث، ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سامنے آنا شروع ہوئے۔ واضح رہے کہ شرق (orient) اور غرب (occident) کے الفاظ، جن کے لاطینی اور عربی، دونوں میں معانی طلوع وغرب کی سمتیں ہیں، ان زبانوں میں قدیم سے استعمال ہو رہے ہیں، تاہم انھیں دو جغرافیائی خطوں کے مفہوم میں، چوتھی صدی عیسوی میں استعمال کیا گیا، جب رومی سلطنت کو مشرقی ومغربی حصوں میں بانٹا گیا۔ بحیرہ روم کے ایک طرف کی دنیا مشرقی، دوسری طرف کی مغربی کہلانے لگی۔ عہدِ وسطیٰ میں، خصوصاً جیفری چاسر (Geoffrey Chaucer۔ وفات: ۱۴۰۰ء) کے یہاں، مشرق یعنی اورینٹ سے مراد، بحیرہ روم کی مشرقی سمت میں موجود ممالک تھے، جیسے ایران وہندوستان۔ مغربی نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی اور جدیدیت کے پہلو بہ پہلو، استعماریت اور شرق شناسی کا آغاز ہوا۔ یورپی ممالک (خصوصاً برطانیہ، فرانس، سپین، پرتگال، نیدرلینڈ) ایشیا، افریقا ولاطینی امریکا، اپنی فوج، انتظامیہ، مشنریوں اور سماجی سائنسوں کے ماہرین کے ساتھ پہنچے، اور انھیں اپنی نوآبادیاں بنایا۔ ان نوآبادیوں کے چیدہ لوگوں نے بھی یورپ کے سفر کیے، اور سفر نامے لکھے۔ جدید عہد سے پہلے یورپی سیاح، ایشیائی وافریقی ممالک آتے اور سفر نامے لکھا کرتے تھے۔ ان سفر ناموں میں متعلقہ ممالک کی کچھ اہم جغرافیائی، ثقافتی، لسانی، ادبی، ماحولیاتی معلومات ہوا کرتی تھیں، مگر یہ اس نوع کے منظم ومرتب علم کے حامل نہیں تھے، جسے مستشرقین نے پیدا کیا۔ چناں چہ یورپ کے مذکورہ سفر ناموں کو بھی مغرب کو سمجھنے کی شخصی مگر ابتدائی، غیر مربوط، سرسری کوششیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ غرب شناسی کے علمی تصوّر، حدود، تقاضوں اور ضرورت پر بحث، سعید کی شرق شناسی کے اثر ہی سے شروع ہوئی، حالاں کہ سعید نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کتاب، اس نوع کا اثر مرتب کرے۔

غرب شناسی پر ابتدائی مباحث، ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سامنے آئے۔ دو مختلف جگہوں سے، اور جداگانہ انداز میں۔ ایک طرف جامعہ قاہرہ کے شعبہ فلسفے کے استاد حسن حنفی (۱۹۳۵ء-۲۰۲۱ء)، اور دوسری طرف درھم یونیورسٹی (انگلستان) کے بشریات کے استاد جیمز جی کیرئیر (James G. Carrier۔ پ: ۱۹۴۷ء) نے کم وبیش ایک ساتھ غرب شناسی پر لکھا۔ دونوں نے اعتراف کیا کہ ان کی غرب شناسی میں دل چسپی کا محرک ایڈورڈ سعید کی شرق شناسی ہے۔

جیمز جی کیریئر نے شرق وغرب کے سوال کو بشریاتی زاویے سے دیکھا ہے۔ بشریات (Anthropology) کا مرکزی سوال، انسانی ثقافت کی تشکیل، انسانی ثقافتوں کے مشترک ومماثل ومتفرق عناصر کی تفہیم ہے۔ کیریئر ۱۹۹۰ء کے اوائل میں، میلنشیا

میں اپنی تحقیق کے سلسلے میں رہا اور وہاں اس نے مغرب (بالخصوص امریکا) سے متعلق عام لوگوں کے سادہ مگر سخت گیر قسم کے خیالات سنے۔ یہیں سعید کی شرق شناسی، ایک نئے انداز میں اس کی توجہ کا مرکز بنی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح شرق شناسی، مشرق کا ایک ایسا تصوّر وضع کرتی ہے، جو مطلق طور پر مغرب سے مختلف ہے۔ نیز مشرق کا یہ تصوّر ایک بند نظام (close system) کے طور پر پیش کیا گیا ہے؛ یہ نہ صرف یکساں رہتا ہے بلکہ مشرق سے متعلق کوئی واقعاتی شہادت بھی، اس تصوّر کو تبدیل نہیں کرتی۔ ''ہم'' اور ''وہ'' کا فرق، ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ''وہ'' یعنی مشرق مخصوص خصوصیات یا مستقل جوہر (essence) کا حامل بن کر، شرق شناسوں کی کتب میں موجود رہتا ہے۔ جیمز کیریئر مشرق کی اس تعریف کو جدلیاتی (dialectical) کہتا ہے، اور اسی تعریف میں غرب شناسی کے آثار دیکھتا ہے۔ وہ غرب شناسی کو مغرب کی جامد، اٹل شبیہوں (stylized images) کا نام دیتا ہے۔ یہی جامد، اٹل شبیہیں، مشرق کی بھی ہیں جو مستشرقین نے بنائیں۔ وہ اس جانب توجہ دلاتا ہے کہ جب مغرب، مشرق کی جامد شبیہ بناتا ہے تو اس شبیہ سے خود غائب نہیں ہوجاتا، وہ اپنی علمیات، اپنے طریق کار کی صورت موجود رہتا ہے۔ کیریئر کے مطابق، گویا شرق شناسی کا بشریاتی مطالعہ، خود مغرب کے علمی سانچوں اور فکر و فہم کے طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔ سادہ لفظوں میں، ایک ماہر بشریات کے لیے شرق شناسی کی روایت اور سعید کی اس روایت پر تنقید میں، مغرب کو پہچاننے کے امکانات موجود ہیں۔۔ ایڈروڈ سعید نے مشرق کی ان جامد شبیہوں اور سٹریوٹائپ کو استعماری طاقت کے تخیل سے وابستہ کیا تھا، جیمز کیریئر محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے، محض 'تعریف کی سیاست' (politics of definition) کا ذکر کرتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ کیریئر یہ سیاست، صرف مستشرقین کے یہاں نہیں، خود مشرقی و افریقی لوگوں کے یہاں بھی دیکھتا ہے۔ اس طور وہ غرب شناسی کو ایک طرف خود مغربی علمی طریقوں میں دیکھتا ہے، دوسری طرف مغرب سے متعلق مشرق کے جامد خیالات میں۔ وہ خود کو ایک غیر جانب دار محقق باور کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

جیمز کیریئر کی کتاب *Occidentalism, Images of the West* روایتی علمی (اکیڈمک) اسلوب کی حامل کتاب ہے۔ معروضی، سرد، احساس سے عاری، لاتعلق لہجے کی حامل۔ جب کہ حسن حنفی کی مقدمہ فی علم الاستغراب، گہرے پرجوش اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ حسن حنفی کے لیے استغراب (Occidentalism)، محض علمی سوال نہیں ہے، خود اپنے ثقافتی وجود کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ان کے لیے استغراب، استشراق کا جواب ہے۔ استشراق نے، مشرق اور اسلام کی من مانی، مسخ شدہ تصویر پیش کی، استغراب اس کے جواب میں مغرب کی تصویر پیش کرتا ہے، مگر اسے مسخ کرتا ہے، نہ اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ گویا استغراب، استشراق کا جواب بنتے ہوئے، اخلاقی حدود کا خیال رکھتا ہے۔ استشراق، اپنی نوعیت اور اثر و عمل میں تباہ کن (destructive orientalism) تھا، جب کہ استغراب اپنے عزم و منصوبے اور عمل میں تخلیقی (creative occidentalism) ہے۔ گویا، استغراب بدلہ نہیں ہے، استشراق کی مذموم علمی و اخلاقی روایت کا محاکمہ اور حل ہے۔ استشراق میں، مشرق موضوعِ مطالعہ ہے؛ مغرب عظیم

تصوّرِ ذات (Self) کا حامل ہے، وہ مشرق کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے غیر (other) کے طور پر دیکھتا ہے؛ اور یہ غیر، برابری کا حامل نہیں، یعنی مشرق، مغرب کا ولن نہیں ہے۔ مشرق، مغرب کے تخیل میں ایک وجود کے طور پر موجود نہیں ہوتا، ایک شبیہ کی صورت ہوتا ہے، ایک خود ساختہ شبیہ، ایک کیری کیچر، جسے مغرب کی عظیم الشان خودی، جیسے چاہے، اپنے نشانے پر رکھ سکتی ہے۔ اس شبیہ سے سیاہ فام، زرد فام، مشرقی استبداد، ابتدائی یا پسماندہ ذہنیت، وحشیانہ فکر، سامی ذہن، عرب ذہن، تشدد، جنونیت، پسماندگی، انحصار، فرقہ واریت، روایت پرستی اور قدامت پسندی جیسے تصوّرات وابستہ کر کے، اپنے پر تشدد، حقارت آمیز اقدامات کو جائز قرار دے سکتی ہے۔ جب کہ یہی مغربی خودی، اپنے لیے سفید فام، مغربی، جمہوریت، منطقی ذہنیت، تہذیب، آریائیت، امن، رواداری، ترقی بلکہ حد سے بڑھی ہوئی ترقی، آزادی، سیکولرزم، جدیدیت، پیش رفت اور مستقبل بینی جیسے تصوّرات منتخب کر کے، ہر طرح کے احساسِ جرم سے آزاد ہو سکتی ہے۔ وجود، اپنے غیر کی شبیہ کو مسلسل اپنے حاکمانہ اختیار میں رکھتا ہے۔ حسن حنفی، اپنے استغراب کے نظریے میں، مشرق و مغرب کی یہ ثنویت تو برقرار رکھتے ہیں، مگر درجہ بندی الٹ دیتے ہیں۔ وہ مشرق کو وجود، عظیم الشان خودی (Self) کا حامل قرار دیتے ہیں، اور یہی خودی مغرب کو موضوعِ مطالعہ بناتی ہے مگر وہ مغرب کو ایک ازلی غیر اور شبیہ میں تبدیل نہیں کرتی۔

حسن حنفی کی مغرب پر ایک تنقید یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ اس طور لکھی ہے کہ جیسے جدید مغرب ہی کائنات کا مرکز ہو، اور تاریخ کا خاتمہ ہو۔ مغرب نے قدیم دنیا کی ہزاروں سال کی تاریخ کو نظر انداز اور رسوا کیا ہے۔ مشرق کے تین ہزار سالوں کو محض ایک باب میں، جب کہ مغرب کی پانچ سو سال کی تاریخ کو سات ابواب میں بیان کیا ہے۔ (یہاں فوری طور پر ول ڈیوراں (Will Durant۔ ۱۸۸۵ء-۱۹۸۱ء) اور ایریل ڈیوراں (Ariel Durant۔۱۸۹۸ء-۱۹۸۱ء) کی *The Story of Civilization* کا خیال آتا ہے جو گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے، صرف پہلی جلد مشرقی ورثے سے متعلق ہے، باقی سب جلدوں کا موضوع یورپ ہے۔) حسن حنفی کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ اب مشرق، مغرب کا مطالعہ کرنے والی فاعل قوت بنے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ کسی زمانے میں چین، ہندوستان، فارس، بابل اور مصر کی اقوام علم و تحقیق کا مرکز تھیں اور مطالعہ کرنے والی فاعل قوتیں تھیں۔ عہدِ وسطیٰ میں مسلمان، مطالعہ کرنے والی فاعل قوت تھی، جب کہ یورپی اقوام، ان کے مطالعے کا موضوع تھیں۔ جدید دور میں یورپی اقوام نے فاعل قوت کا منصب سنبھالا اور مسلم دنیا، ان کے مطالعے کا موضوع بنی۔ استغراب، ایک بار پھر مسلم اقوام کو مطالعہ کرنے والی فاعل قوت بنانے کا خیال پیش کرتا ہے، اور یورپ کو مطالعے کا موضوع۔

حسن حنفی کو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کہیں ان کا استغراب کا نظریہ، استشراق کے انتقام میں تبدیل نہ ہو، اس لیے وہ یورپ کو مطالعے کا موضوع تو بنانے کی بات کرتے ہیں، مگر اس کے مقاصد کا دائرہ مسلم قوم، تیسری دنیا اور اس سے آگے پوری انسانیت تک پھیلاتے ہیں۔ چناں چہ ان کا آدرش یہ ہے کہ استغراب، پوری انسانیت کے مشترکہ ثقافتی گھر کی تخلیق کا وسیلہ بنے۔ بایں ہمہ وہ اس بات کو کسی مرحلے پر فراموش نہیں کرتے کہ استغراب کا بنیادی مقصد، تیسری دنیا (موجودہ اصطلاح میں عالمی جنوب (Global

South) کی نو آبادیات کی زنجیروں سے آزادی ہے۔ نو آبادیات کی زنجیریں، صرف سیاسی و عسکری نہیں، علمی، ثقافتی اور نفسیاتی بھی ہیں۔ استغراب، انھی علمی، ثقافتی اور نفسیاتی علمیاتی زنجیروں سے آزادی کا لائحہ عمل ہے۔ اس طور حسن حنفی، ردِّ نو آبادیات کو استغراب کا اہم حصہ قرار دیتے ہیں، تاہم صرف اسی تک محدود نہیں کرتے۔

وہ استغراب کا ایک عملی منصوبہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کا مدعا، اسے نئی سائنس بنانا ہے، استشراق کی مانند ایک علمی ڈسپلن، مگر مقاصد کے اعتبار سے جدا۔ وہ کہتے ہیں کہ استغراب کا مواد دو ذرائع سے آئے گا۔ تیسری دنیا کے دانش وروں کی مغرب پر تنقید سے، اور خود مغرب کے دانش وروں کی تنقید سے۔ جیسے روسو(Jean-Jacques Rousseau۔ ۱۷۱۲ء-۱۷۷۸ء)، سپنگلر، میکس شیلر، نطشے(Friedrich Nietzsche۔ ۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء)، ہسرل(Edmund Husserl۔ ۱۸۵۹ء-۱۹۳۹ء)، دریدا(Jacques Derrida۔ ۱۹۳۰ء-۲۰۰۴ء)، بارت(Roland Barthes۔ ۱۹۱۵ء-۱۹۸۰ء) وغیرہ۔ اسی طرح وہ یورپی شعور کے مطالعے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یورپی شعور کی ایک مخصوص ساخت ہے، اس کے خاص سر چشمے ہیں، اس شعور کا آغاز ہے، اور انجام بھی ہے، اور اس کا تاریخی ظہور و ارتقا بھی ہے۔ یورپ پر تنقید اور یورپی شعور کی ساخت و تاریخ کا مطالعہ، استغراب کا اہم مقصد ہے۔

ہم نے حسن حنفی کے تصوّراتِ استغراب کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلی بات یہ واضح ہوتی ہے کہ ایڈورڈ سعید نے جس کی ممانعت کی تھی، حسن حنفی نے وہی کیا ہے۔ سعید شرق شناسی کا جواب، غرب شناسی کی صورت نہیں چاہتا تھا۔ حسن حنفی نے اپنے استغراب کے نظریے میں، شرق شناسی کا جواب ہی لکھا ہے، یہ الگ بات کہ استشراق کی ان غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے، جنھیں سعید نے واضح کیا ہے۔ گویا استشراق کا ایک تصحیح شدہ، صالح قسم کا متبادل ورژن پیش کیا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ غرب شناسی کا یہ جواب بھی خود ایڈورڈ سعید ہی کی کتاب سے تیار کیا ہے۔ حسن حنفی نے کہیں تو سعید کے خیالات کی تسہیل کی ہے، کہیں سعید کی 'علم اور طاقت میں باہمی رشتے' کی منطق استعمال کی ہے۔ حسن حنفی کے ان خیالات سے ایک اور بات بھی ظاہر ہے۔ صرف مصری ہی نہیں، ایرانی، پاکستانی، ہندوستانی مسلمان بھی، مغرب کے استشراق کا جواب، مغربی تہذیب پر تنقید ہی کی صورت دیتے آئے ہیں، اور اس کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر سے ہو گیا تھا۔ بعد کے مفکرین یہی مؤقف اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً زائحہ صالحی(Zahia Smail Salhi۔ جو مانچسٹر یونیورسٹی میں جدید عربی ادبیات کی پروفیسر ہیں) کا خیال ہے کہ "در حقیقت شرق شناسی کو چیلنج کرنا ہی غرب شناسی کی روح اور اس کی بنیادی اساس ہے"۔

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اتنا کہنا مناسب ہو گا کہ جب حسن حنفی، مغرب پر خود مغرب اور مشرق کی تنقید ہی کو استغراب کا بنیادی مواد قرار دیتے ہیں تو ایک علمیاتی مخمصہ پیدا کرتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ استغراب، اگر ردّ نو آبادیاتی مقصد کی حامل ہے

تو پھر اسے مغرب پر اپنے ہر انحصار کا خاتمہ کرنا چاہیے، اور سب سے بڑا انحصار علمی ہوا کرتا ہے۔ مغرب کے علم کے لیے، مغرب ہی کی تنقید کو بنیاد بنانا، غیر معمولی انحصار ہے، مغرب کے ذہن تک، خود مغرب ہی کے راستے سے پہنچنے کی کوشش ہے۔ تب آپ مغرب کا علم حاصل نہیں کر رہے، مغرب ہی کے علم کو مغرب ہی کے ضمن میں دہرا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مغرب پر تنقید، خواہ وہ 'داخلی مغربی' ہو یا 'خارجی مشرقی'، استغراب کو پہلے ہی قدم پر ایک خاص رخ دے دیتی ہے۔ علم کا حصول، آزادانہ ہوتا ہے، اور علمی تحقیق میں سامنے آنے والے ان نتائج کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے جو آپ کے ابتدائی مفروضے کے خلاف ہوں یا آپ کے نظریات وعقائد کو چیلنج کرتے ہوں۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ حسن حنفی یہاں عمومی مسلم ذہن کی نمائندگی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ذہن، مغرب کو ایک لائق تنقید معروض کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس ذہن کی تشکیل، استعماری عہد میں، استعماریت ہی کے نظام کے تحت، اور اس کے ردّ عمل میں ہوئی ہے۔ ردّ عمل کی اپنی نفسیات ہی نہیں، اپنی علمیات بھی ہوتی ہے۔

یہ کہ مسلم ذہن خصوصی طور پر اور مشرقی ذہن عمومی طور پر، مغرب کو لائقِ تنقید معروض کے طور پر دیکھتا ہے، اس کے مطالعے کو بھی 'غرب شناسی' کا نام ملا ہے۔ یہاں ہمارا اشارہ آئن بروما (Ian Buruma۔ پ:۱۹۵۱ء) اور اویشائی مارگلٹی (Avishai Margalit۔پ:۱۹۳۹ء) کی کتاب *Occidentalism: The West in the Eyes of its Enemies* کی طرف ہے، جسے سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں ردِّ عمل کی نفسیات کا مطالعہ، ردِّ عمل کے اسلوب میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب، ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ گیارہ ستمبر کے تین برس بعد۔ کتاب کا مطالعہ کریں تو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اس کا محرک بھی گیارہ ستمبر ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کو محض ایک جدید امریکی شہر کے سب سے بڑے تجارتی مرکز پر حملہ تصوّر نہیں گیا تھا، بلکہ امریکی قوم اور مغربی تہذیب پر 'بنیاد پرست مسلمانوں اور مغربی تہذیب کے دشمنوں' کے حملے کے طور پر دیکھا گیا تھا۔ گیارہ ستمبر کے کمیشن کی رپورٹ میں، عرب اور مسلم دنیا کو 'دشمن' کہا گیا ہے، اور اس کتاب کے عنوان میں 'مغرب کے دشمن' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بروما اور مارگلٹی کی اس کتاب کا دوسرا باب، گیارہ ستمبر ہی سے متعلق ہے۔ اس باب کا عنوان بھی معنی خیز ہے: استغرابی شہر (Occidental city)۔ مغربی تہذیب کے عروج کا نمائندہ شہر، جو اس کتاب کے مصنفین کے مطابق، مغربی تہذیب کے دشمنوں کی نظر میں گناہ گار شہر ہے، اور گناہ گار شہر کو زمین پر موجود ہونے کا حق نہیں۔

سادہ، صحافیانہ اسلوب میں لکھی گئی اس کتاب میں غرب شناسی سے مراد ''مغرب کی وہ انسان کش تصویر ہے، جسے مغرب کے دشمنوں نے بنایا ہے''۔ گویا غرب شناسی کا دوسرا نام، مغرب کا معاندانہ تصوّر ہے۔ اس کتاب میں ایڈورڈ سعید کا ذکر موجود ہے، نہ اس کی شرق شناسی پر کڑی تنقید کا، البتہ فرانز فینون (Frantz Fanon۔ ۱۹۲۵ء-۱۹۶۱ء) اور علی شریعتی (۱۹۳۳ء-۱۹۷۷ء) کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان خیالات کو بھی 'مغرب پر جائز تنقید' کے بجائے، مغرب کی مخالفت میں پیش کیے گئے تصوّرات کے طور پر پیش کیا گیا

ہے۔ علی شریعتی کا یہ خیال کہ "مغرب کے روگ کا علاج، مشرق کی مذہب اساس ثقافتی شناخت میں ہے" درج کیا گیا ہے۔ یعنی مذہب، سیکولر، لادین مغرب کا توڑ ہے۔ اس رائے کو مغرب دشمنی کی ذیل میں رکھا گیا ہے۔

مغرب سے متعلق مشرق میں جو عمومی تصوّرات پائے جاتے ہیں، اور جن میں بلاشبہ کئی سٹیریو ٹائپ ہیں، انھیں مغرب دشمنی کا نام دیا گیا ہے، اور ان کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مشرق میں مسلمان ممالک، جاپان اور چین کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز ہی، دوسری جنگِ عظیم میں، جاپان کے امریکا پر حملے کے ذکر سے ہوا ہے۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں جاپانی شہر کیوتو (Kyoto) میں جاپانی ادیب و فلسفی جمع ہوئے۔ انھوں نے یہ رائے دی کہ مغرب کی اس "زہریلی مادیت پسند تہذیب" کے خلاف جنگ جائز ہے، جس کی بنیاد یہودی سرمایہ داریت پر ہے۔ اسی کانفرنس میں یہ بھی کہا گیا کہ جاپانی تہذیب روحانی گہرائی کی حامل ہے جب کہ مغربی تہذیب سطحی، بے بنیاد ہے، اور تخلیقی قوتوں کے لیے تباہ کن ہے۔ اس کتاب کے مصنفین، جاپان کو مغربی تہذیب کا پروردہ بھی کہتے ہیں اور مغربی تہذیب کا مخالف بھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کچھ جاپان میں، مغرب کے تعلق سے موجود ہے، وہ باقی مشرقی ممالک میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب کو سطحی، مادی، بے بنیاد، لادین، کافرانہ کہنا مشرقی ممالک میں عام ہے۔ یہی ممالک، مغرب کی اشیا، ٹیکنالوجی، تصوّرات، کثرت سے استعمال کرتے ہیں، اور اسی مغرب کے لیے گہری عداوت کے جذبات کے حامل بھی ہیں۔ دونوں مصنفین کا یہ مؤقف بھی ہے کہ مشرق میں سیاست، معیشت، سائنس، مذہب الگ نہیں ہیں؛ مسلمان ملکوں نے چرچ اور بادشاہت کی علیحدگی کا تجربہ نہیں کیا، اس بنا پر وہ ایک کلی تصوّرِ دنیا (total vision) رکھتے ہیں (جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی: اقبال)، اور یہی کلی تصوّر، ان کے یہاں مطلق العنانیت پیدا کرتا ہے۔ مطلق العنانیت میں، روس بھی ان مشرقی ممالک کا ہم نوا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جاپان کی مغرب مخالفت پر کئی صفحات لکھے گئے ہیں، مگر جاپان پر امریکا کے ایٹمی حملوں کا ذکر تک موجود نہیں، جس طرح گیارہ ستمبر کے کمیشن کی رپورٹ میں، مسلمان ممالک میں ردِ نو آبادیاتی تحریکوں کا ذکر موجود ہے، مگر مغربی نو آبادیات، مشرقِ وسطیٰ کی بندربانٹ اور افغانستان میں امریکی حمایت سے شروع کیے گئے جہاد کا ذکر غائب ہے۔

اس کتاب کا ایک قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ غرب شناسی، یعنی مغرب کی معاندانہ تصویر، کی بنیاد بھی خود مغرب نے فراہم کی۔ ان کے مطابق مغرب پر تنقید کا آغاز جرمن رومانویت پسندوں، نازیوں اور مابعد روشن خیالی کے مغربی دانش وروں نے کیا۔ جرمن رومانویوں نے جرمن، فرانسیسی عقلیت پسندی اور آفاقیت پر تنقید کی، نپولین کی توسیع پسندی کی ملامت کی۔ اسی تنقید کا ذکر حسن حنفی کے یہاں بھی ملتا ہے۔ مغربی تہذیب پر تنقید کرنے والوں میں کارل مارکس بھی شامل تھا، جس کی قبر پر حاضری کے دوران، بروما اور مارگلٹی کو یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ ان کے نزدیک، کیپٹلزم، مارکس ازم اور دوسرے ازم کی مانند اوکسیڈینٹل ازم کی بنیاد بھی یورپ نے

رکھی۔ گویا یہ یورپ ہی تھا، جس نے اپنا مخالف پیدا کیا، اور مشرق اس قدر بانجھ تھا کہ وہ یورپ کا خالص دشمن بھی تخلیق نہیں کر سکا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ مغرب اور بالخصوص امریکا سے کچھ شکایات ہو سکتی ہیں، لیکن ''پوری مغربی تہذیب کو روح سے خالی، انحطاط پذیر، ہوسِ دولت میں مبتلا، بے بنیاد، بے عقیدہ، بے حس طفیلیوں کے ڈھیر میں بدل دینا، دانش ورانہ تباہی کی صورت ہے''۔ پوری مغربی تہذیب کو روح سے خالی کہنے والا ذہن، کیسے استعماریت کے نتیجے اور ردّعمل میں وجود میں آیا، اور خود یہ ذہن کس روگ کا شکار ہے، اس کا تجزیہ، کتاب میں موجود نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کتاب، ایک طرف گیارہ ستمبر کے بعد امریکی اقدامات کو 'ثقافتی جواز' فراہم کرنے کا مقصد رکھتی ہے، دوسری طرف مغرب کے ''دشمنوں'' کے خلاف استغاثہ تیار کرتی ہے، نیز مغرب کی سیکولر، جمہوری اقدار، سائنسی علم، ترقی وغیرہ کا دفاع کرتی ہے۔ اس سوال سے بحث نہیں کرتی کہ کیا ان سب موضوعات کے لیے غرب شناسی یعنی Occidentalism کی اصطلاح کا استعمال جائز ہے؟

یہاں ہم دو ایسی کتابوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جن میں مغرب کو بانداز دیگر دیکھا گیا ہے۔ پہلی کتاب میکا ناتف (Mika Natif) کی *Mughal Occidentalism* ہے۔ وہ مغرب کا کوئی سٹریوٹائپ نہیں بناتیں۔ وہ سعید کی شرق شناسی کے بنیادی مقدمے کو بھی سامنے نہیں رکھتیں۔ وہ مغل مصوّری اور مغربی مصوّری کے امتزاج کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ غرب شناسی کی اصطلاح کو خود اپنے وضع کیے ہوئے مفہوم میں استعمال کرتی ہیں، اور اس کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ''میں مغل غرب شناسی (Mughal Occidentalism) کو اس معنی میں استعمال کروں گی کہ کس طرح منتخب یورپی عناصر اور تکنیک کو مغل مصوّری میں از سر نو برتا گیا، اور ضابطہ بند کیا گیا''۔ دوسری کتاب چینی نقاد شاؤمی چن (Xiaomei Chen) کی *Occidentalism: A Theory of Counter-Discourse in Post-Mao China* ہے۔ شاؤمی چن، حسن حنفی کی مانند، غرب شناسی کو متبادل کلامیے ہی کے طور پر دیکھتی ہیں، مگر ان کا متبادل کلامیے کا تصوّر مختلف ہے۔ ایڈورڈ سعید اپنی شرق شناسی کے تجزیے میں، اور حسن حنفی اپنے نظریہ استغراب میں مغرب کو غلبے کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اکثر مسلمان مفکرین، ردِّ نو آبادیاتی نقاد بھی جدید مغرب کو استعماریت اور استحصال کی علامت ہی تصوّر کرتے ہیں۔ ارجنٹائن کے والٹر ڈی مگنولو (Walter D. Mignolo۔ پ: ۱۹۴۱ء) تو جدیدیت اور نو آبادیت (coloniality) کو ایک ہی سکے کے دو رُخ کہتے ہیں۔ یعنی یورپی جدیدیت (سرمایہ داریت، ترقی، جمہوریت)، نو آبادیت (غلبہ، نسل پرستی، استحصال) کے بغیر نہیں ہے۔ چناں چہ وہ علمیاتی نافرمانی (Epistemic Disobedience) لازم قرار دیتے ہیں؛ اس بات سے انکار کہ حقیقت اور سچائی کو سمجھنے کا واحد طریقہ اور معیار یورپی جدیدیت و فلسفہ ہے۔ اس نافرمانی کے نتیجے میں، وہ مقامی تہذیب و علم کی روایتوں کی بازیافت کرتے ہیں۔ خود ہمارے یہاں مقامیت پسندی کے رجحانات میں، ''مرکز'' کی نافرمانی کا تصوّر کام کر رہا ہوتا ہے۔ شاؤمی چن، اسی مغربی جدیدیت کو دوسرے رخ سے دیکھتی ہیں۔ وہ مغربی جدیدیت کو چین کے لیے ''غیر'' تو سمجھتی ہیں، مگر ایک علامتی غیر۔ حقیقی غیر سے تلخ

ماضی کی کئی یادیں وابستہ ہوتی ہیں، جب کہ علامتی غیر سے ایسی کوئی یاد وابستہ نہیں ہوتی؛ وہ ایک دوسری، مختلف علمی روایت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ شاؤمی چن کے مطابق، مغرب کا علامتی غیر، چینی مفکروں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ خود چینی سماج پر ایک غیر کی مانند تنقیدی نگاہ ڈال سکیں۔ گویا ان کی نظر میں مغربی جدیدیت، ناگزیر برائی نہیں ہے، جس کی نافرمانی ہی میں غیر مغربی معاشروں کی نجات ہے۔ وہ سعید پر تنقید نہیں کرتیں، سعید سے جدا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ اس کا سبب، خود چین کا مختلف تجربہ ہے۔ چینی مفکرین نے ماؤ کے بعد کے عہد میں مغربی علم کو چینی صورتِ حال پر تنقید اور اصلاح کے لیے استعمال کیا۔ ان کے لیے مغرب شناسی، چینی سماج کی صورت حال کو سمجھنے اور بدلنے کا ایک متبادل راستہ مہیا کرتی تھی۔ شاؤمی چن، مغربی علم، مغربی جدیدیت کو استعماریت کا ایک رخ نہیں سمجھتیں اور اسی بنا پر اس سے استفادے کی چینی تاریخ کا جائزہ لیتی ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے غرب شناسی کے رجحان کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ہم نے دانستہ اسے غرب شناسی کی روایت نہیں کہا، اس لیے نہیں کہ روایت دہائیوں میں نہیں، صدیوں میں بنتی ہے، بلکہ اس لیے کہ علم کا وہ ہمہ گیر، وسیع، کثیر، متنوّع ذخیرہ ابھی وجود میں نہیں آیا، جسے غرب شناسی کے سائنسی، اکیڈمک ڈسپلن کے تحت رکھا جاسکے۔ تاہم یہ اعتراف کیا جانا چاہیے کہ غرب شناسی پر مباحث، ایک طرح کی بو قلمونی رکھتے ہیں، تاہم یہ موضوعات و مسائل کی نہیں، نقطہ ہائے نظر کی بو قلمونی ہے۔ صاف لفظوں میں، مغرب کے سائنسی بنیادوں پر مفصل تاریخی وبشریاتی مطالعات کم کیے گئے ہیں، مغرب پر غیر مغربی نظر زیادہ ڈالی گئی ہے، اور اسی میں تھوڑا بہت تنوع ہے۔ یعنی یہ غیر مغربی نظر کہیں مغرب کا محاسبہ کرتی ہے، اسے تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا کرتی ہے، کہیں اس کے تہذیب و علم و فن کے سیکولر امتیازات کا مطالعہ کرتی ہے، تاکہ اسے مشرقی، مذہبی روحانی تہذیب سے جدا تصوّر کیا جاسکے، اور اس کے نتیجے میں، مغرب سے گریز کا جواز تلاش کیا جاسکے یا مغرب سے استفادے کا امکان دیکھا جاسکے۔ اسی مقام پر یہ دو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ردِّ نو آبادیاتی مطالعات (Decolonial Studies) اور غرب شناسی (Occidentalism) میں کیا فرق ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے عمومی تنقیدی مطالعے کو غرب شناسی (بہ طور سائنسی، علمی شعبہ علم) کا نام دیا جاسکتا ہے؟

پہلے تو یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ردّ نو آبادیاتی مطالعات ہوں یا مغربی تہذیب کے عمومی تنقیدی مطالعات، یہ دونوں کئی مقامات پر آپس میں ملتے ہیں۔ مغرب کی پرانی یا نئی نو آبادیات سے متعلق تجزیاتی تحریروں میں، مغربی تہذیب پر بھی گہری نظر ڈالی جاتی ہے، اور مغربی تہذیب کی تنقیح کرتے ہوئے، اس کی استعماری روشوں پر احتسابی نظر ڈالی جاتی ہے۔ وجہ سادہ ہے۔ ثنویت۔ اس ثنویت کی ذمہ داری یورپی نو آبادیات پر عائد ہوتی ہے۔ اسی نے استعماری عہد میں ایشیا و یورپ، مشرق و مغرب، جدیدیت و قدامت یا روایت، سائنس و مذہب، ترقی و پس ماندگی، تاریخ و اساطیر، تہذیب و وحشت کی ثنویتیں پیدا کیں اور یہ ثنویتیں ذرائع ابلاغ، تعلیم، آئین، ادب کے علاوہ شرق شناسی کی پوری روایت میں سرایت کر گئیں۔ کپلنگ کا ''مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب ہے'' کا مقولہ، اس ثنویت کو

ایجاد نہیں کرتا، ایک قدرے کہنہ خیال کو مقبولِ عام بناتا ہے۔ یہ ثنویت، دو خطوں کے باہمی فرق کو مستقل بناتی ہے، ان کے درمیان اشتراک کی موجودگی اور امکان کا خاتمہ کرتی ہے، دونوں میں درجہ بندی قائم کرتی ہے۔ نیز، خود ان خطوں کے حقیقی تہذیبی، علمی، جمالیاتی امتیازات پر پردہ ڈالتی ہے۔ مشرق، ایک کل تصوّر ہوتا ہے، اور مغرب بھی۔ یعنی ان خطوں کا جغرافیہ، تاریخ، نظریہ، علم، سب ان دونوں کے اپنے اپنے کل میں ضم ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ دونوں ایک دوسرے کے مطالعے میں بھی کلی طریقے کا استعمال کرتے ہیں۔ مشرق، مغرب کا مطالعہ کرتے ہوئے، مغرب کی جدیدیت، استعماریت، تہذیب، علوم، فنون، ریاست سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ردِّ استعماری تجزیے میں مغربی تہذیب کو معاون کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور مغربی تہذیب پر تنقید میں استعماریت و جدیدیت بھی ہدف بنتی ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ استعماریت و مغربی تہذیب کا یہ تجزیہ، شرق شناسی ہی سے ماخوذ ہے۔ شرق شناسی میں بھی پورے مشرق، اس کے جملہ مادی، سماجی، علمی، مذہبی، تخیلی، جمالیاتی مظاہر کو یکساں طور پر پس ماندہ، وحشیانہ، انحطاط پذیر تصوّر کیا جاتا تھا۔ بایں ہمہ، ردِّ نو آبادیاتی مطالعات اور مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعات میں بنیادی فرق کا لحاظ ضروری ہے۔ یہ فرق، ترجیح کا ہے۔ اگر ترجیح نو آبادیات ہے تو مغربی تہذیب پر تنقید ضمناً ہوگی، اور اگر ترجیح مغرب کی سیکولر تہذیب پر تنقید ہے تو استعماریت پر تنقید ثانوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ ردّ نو آبادیاتی تنقید میں نو آبادیات کے لسانی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی، معاشی، سیاسی پہلو ترجیحی طور پر معرضِ مطالعہ میں لائے جاتے ہیں، جب کہ مغرب کے تہذیبی تجزیے میں، سیکولرزم، دین، جدیدیت، روایت، مادیت، مابعد الطبیعیات جیسے مباحث مرکزی توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔ یہاں ہم اس طرزِ مطالعہ کا ایک بار پھر ذکر کرنا چاہتے ہیں، جس میں ردّ نو آبادیاتی اور مغربی تہذیبی مطالعات کو ضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے نمائندے والٹر مگنولو ہیں، اور جسے ہمارے یہاں بھی پذیرائی حاصل ہے۔ اس طرز مطالعہ میں استعماریت اور جدید مغربی تہذیب کو ایک ہی سکے کے دو رخ تصوّر کیا جاتا ہے۔ چناں چہ یورپی جدیدیت کو ابلیسیت تصوّر کیا جاتا ہے اور استعماریت کا سیاہ چہرہ سمجھا جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے (غالباً گیارہ ستمبر کے اثر سے) یہ طرزِ مطالعہ خصوصی طور پر فروغ پایا ہے۔ جدید و مابعد جدید مغربی مفکرین و فلاسفہ کا مطالعہ، اس زاویے سے کیا جاتا ہے کہ انھیں سیکولر، دہریت پسند یا دین مخالف، مابعد الطبیعیات کے خفیہ یا اعلانیہ منکر دکھایا جاتا ہے، نیز پرانے یا نئے استعمار کے حامی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور ملامت کی جاتی ہے، اور ملامت کرنے کے لیے اپنی مذہبی، روحانی ثقافتی شناخت کو اساس بنایا جاتا ہے۔

اب ہم واپس اپنے ہی اٹھائے گئے سوال کی طرف آتے ہیں۔ یہ کہ کیا ردِّ نو آبادیاتی اور مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعات، غرب شناسی یعنی Occidentalism کی ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں؟ یہ درست ہے کہ حسن حنفی اور کچھ دوسرے مفکر، استعماریت سے نجات کو غرب شناسی کا ایک اہم مقصد قرار دیتے ہیں، اور ان کی نظر میں مغرب کو سمجھنا، گویا اپنے ثقافتی وجود کو استعماریت کی علمی، تہذیبی، نفسیاتی زنجیروں سے آزاد کرانا ہے، مگر ہماری نظر میں غرب شناسی، ردّ نو آبادیات اور مغربی تہذیب کے

تنقیدی مطالعات سے الگ ہے۔ یہ سمجھنا کہ مغرب سے متعلق ہر رائے، تاثر، تبصرہ، تجزیہ، سب غرب شناسی کی ذیل میں آتا ہے، علمی معاملات کو سرسری دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اردو شاعروں میں اکبر (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء)، اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)، ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء-۱۹۵۶ء)، جوش (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء)، راشد (۱۹۱۰ء-۱۹۷۵ء) بطور خاص مغرب، مغربی تہذیب اور استعماریت سے متعلق بنیادی اور اہم باتیں کہتے ہیں؛ ان کے یہاں مغربی تہذیب کی مادیت پسندی، جمہوریت، سرمایہ داریت، مذہب بیزاری، فرد کی آزادی اور استعماری قوتوں کے استحصال سے متعلق یادگار اشعار اور نظمیں موجود ہیں۔ اسی طرح نذیر احمد (۱۸۳۶ء-۱۹۱۲ء)، سرشار (۱۸۴۶ء-۱۹۰۳ء)، پریم چند (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء)، منٹو (۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء)، قرۃ العین حیدر (۱۹۲۶ء-۲۰۰۷ء)، انتظار حسین (۱۹۲۵ء-۲۰۱۶ء)، شمس الرحمٰن فاروقی (۱۹۳۵ء-۲۰۲۰ء) کی افسانوی تحریروں میں یورپی استعمار کے معاشی، تہذیبی استحصال، سماجی تفریق، مغربی جدیدیت کے مقابلے میں اپنی تہذیبی روایت کی بازیافت کی عمدہ کوششیں ملتی ہیں لیکن انھیں غرب شناسی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ حسن عسکری (۱۹۱۹ء-۱۹۷۸ء) اور ان کے مکتبہ فکر کے نقادوں کی مغربی تہذیب پر تنقید کو بھی غرب شناسی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسے مغربی تہذیب پر مشرقی زاویہ نظر (جس کی تشکیل استعماری عہد میں ہوئی) سے کی گئی تنقید ہی سمجھا جانا چاہیے، جس کے پس منظر میں مشرق و مغرب کی ثنویت اور جوہریت، اپنے علمیاتی دباؤ کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غرب شناسی ایک تصوّر کے طور پر تیس پینتس برسوں سے ضرور زیر بحث ہے، مگر وہ حقیقی طور پر موجود نہیں ہے۔ آغاز میں ہم نے ایڈورڈ سعید کی شرق شناسی کے آخری باب سے، ایک سطر درج کی تھی۔ یہ کہ شرق شناسی کا جواب، غرب شناسی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ سعید کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سعید کو یہ احساس تھا کہ مسلمان، اس کتاب کو اگر اسلام کا دفاع نہ بھی سمجھیں، تب بھی یہ کتاب، یورپی استعمار کو، مشرق وسطیٰ کے ضمن میں، تاریخ کے کٹہرے میں ضرور کھڑا کرے گی۔ اس کتاب کو عرب دنیا میں خصوصاً اور باقی اسلامی دنیا میں عموماً اسلام کا دفاع ہی سمجھا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے ۱۹۹۴ء میں شرق شناسی کا پس نوشت (Afterword) لکھا۔ اس میں، سعید نے کتاب کی پذیرائی و تنقید دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ پس نوشت، سب سے زیادہ غرب شناسی یعنی Occidentalism کے سوال کو سمجھنے میں معاون ہے۔ اس میں سعید دو تین بنیادی باتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ جوہریت پسندی (essentialism) میں یقین نہیں رکھتا۔ یعنی وہ کسی تہذیب کو واحد، فیصلہ کن، مطلق، نایاب، اور اسی تہذیب سے حتمی طور پر مخصوص جوہر کا حامل نہیں سمجھتا۔ یہ تصوّر، ثقافتوں میں فرق و امتیاز کی آہنی لکیر کھینچتا ہے۔ سعید ہر کلچر کو دوسرے کلچر سے مختلف ضرور کہتا ہے مگر اس فرق کو اتنا حتمی نہیں سمجھتا کہ ایک کلچر، دوسرے کلچر کی مستقل مخالفت کے سوا ہر امکان کا خاتمہ کردے۔ وہ ہر کلچر کی ایک مخصوص مقامی بنیاد کو تو تسلیم کرتا ہے، مگر اسے غیر مبدّل، مطلق جوہر خیال نہیں کرتا۔ چناں چہ وہ اس کا قائل ہے کہ ہر ثقافت مخلوط عناصر سے ترکیب پاتی ہے یا دوسری ثقافتوں سے اختلاط کے امکانات رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ وہ ثنویت کا نقاد ہے، حامی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "مشرق بہ مقابلہ مغرب کا تضاد گمراہ کن اور انتہائی غیر مطلوب تھا"۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں دو واحدانی سیاسی اور ثقافتی مخالفین میں مخاصمت کو مستقل بنا رہا ہوں"۔ یعنی اسلام و مغرب کو۔ وہ اس الزام کی تردید بھی کرتا ہے کہ وہ مغرب کا مخالف ہے۔ برناڈ لیوس(Bernard Lewis۔۱۹۱۶ء-۲۰۱۸ء)اور ابن وراق(Ibn Warraq۔۱۹۴۶ء)نے بطور خاص، سعید کو مغرب مخالف کہا۔ سعید، شرق شناسی کو مغربی تہذیب کے جوہر کے طور پر نہیں دیکھتا، وہ اسے ایک ڈسکورس کے طور پر دیکھتا ہے، جس میں علم، طاقت کا معاون ہوتا ہے۔ یہ ڈسکورس، پوری مغربی تہذیب کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس ڈسکورس میں "ہم" اور "وہ" کی تقسیم موجود تھی، یعنی ثنویت۔ "ہم" یعنی یورپ کو "وہ" یعنی مشرق پر سیاسی اختیار ہی نہیں، علمی و ثقافتی برتری بھی حاصل تصوّر کی گئی تھی۔ یورپ نے مشرق واسلام کی ایک تصویر، ایک سٹریو ٹائپ، ایک آئیڈیالوجیائی فکشن، ایک اسطورہ، بنائی، جس کا کوئی تعلق حقیقی مشرق واسلام سے نہیں تھا۔ چوں کہ یورپ کو سیاسی، معاشی، ابلاغی، تعلیمی وسائل پر اجارہ حاصل تھا، اس لیے، اس مکمل فکشن کو مسلسل تکرار سے پیش کیا گیا اور اس سے حقیقی اثرات پیدا کیے گئے۔ یہ مشرق واسلام کی نئی شناخت تھی۔ یورپ، مشرق واسلام کو لازمی غیر کے طور پر دیکھتا تھا، اور اسے اپنا ہدف بناتا تھا۔ سعید کے نزدیک اس ڈسکورس میں، ایک اور چیز کام کر رہی تھی۔ تعبیر یعنی interpretation۔ مستشرقین، مشرق واسلام کا خالص علمی مطالعہ نہیں کر رہے تھے، امپائر کے سیاسی نقطۂ نظر کو تقویت فراہم کر رہے تھے، اور اس کے لیے تعبیری حربے(interpretative strategies) اختیار کر رہے تھے اور مشرق واسلام کی تعریف پر اجارہ حاصل کر رہے تھے۔ صاف لفظوں میں، وہ علم کی حقیقی سلطنت وجود میں نہیں لا رہے تھے، سلطنت کے لیے علم پیدا کر رہے تھے۔ سعید نے شرق شناسی کے اسی ڈسکورس، اسی فکشن، انھی سیاسی تعبیری حربوں، علم وطاقت، تعبیر کے خالص سیاسی رخ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ صاف کہتا ہے کہ استشراق سے اگر کوئی معنی اخذ کیا جاسکتا ہے تو یہ کہ ہم اس علم سے کیسے بچ سکتے ہیں، جس میں تعصب، طاقت سرایت کر گئے ہوں۔ شرق شناسی کی یہ ساری وضاحت، خود سعید کو اخلاقی طور پر پابند بناتی ہے کہ وہ استشراق کے جواب میں ایسے استغراب کی حمایت نہ کرے، جس میں مغرب سے متعلق سٹیریو ٹائپ ہوں، آئیڈیالوجیائی فکشن ہو، مغرب کو مشرق کا غیر بنا کر دیکھا گیا ہو، اور علم و تعصب کو ایک نئے انداز میں یک جا کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی، غرب شناسی کو محال بناتی ہے۔ شرق شناسی نے استعماریت کو تقویت بھی دی، اور اسی کے سبب وجود میں بھی آئی۔ یعنی شرق شناسی واستعماریت میں ایک باطنی گٹھ جوڑ ہے۔ کیا غرب شناسی، ایک امپائر کے بغیر وجود میں آسکتی ہے؟ شرق شناسی تو امپائر کی ضرورت تھی، امپائر کو اپنے محکوم، بطور غیر، اور وجود سے محروم محض ایک امیج کے طور پر درکار تھے، غرب شناسی کس کی ضرورت ہے؟ کیا مشرق، واقعی ایک نئی امپائر کا تخیل رکھتا ہے، جس میں مغرب محکوم، ایک غیر، محض ایک امیج، ایک کیری کیچر ہو گا، اور اس کے لیے اسے غرب شناسی کی وسیع و متنوع روایت درکار ہو گی، یعنی علم اور سلطنت ایک ساتھ ہوں گے؟ یہ سوالات اس وقت تک رہیں

گے، جب تک غرب شناسی، شرق شناسی کا جواب، اس کے الٹ (reversal) کے طور پر تصوّر کی جاتی رہے گی۔

غرب شناسی کی یہ بحث ہمیں، انسانی تہذیب کو مشرق و مغرب کی ثنویت سے بالاتر ہو کر دیکھنے کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ گلدستہ پامال استعارہ ہے، مگر انسانی تہذیب کے لیے کامل استعارہ ہے۔ گلدستے میں کئی رنگوں کے، چھوٹے بڑے پھول ہوتے ہیں۔ گویا سلطنتیں، قومیں، قبائل، گروہ، سب اس گلدستے میں شامل ہیں۔ کوئی گل سرسبد ہوتا ہے تو کوئی ایک کلی جسے ابھی پھول بننا ہے۔ مجموعی انسانی تہذیب میں کسی کا حصہ زیادہ، کسی کا کم ہے؛ کوئی ابھی اس پرندے کی طرح ہے، جو اپنی پہلی پرواز کے لیے پر تول رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سب، چھوٹی بڑی، عظیم آثار کی حامل، اور کسی بھی تاریخی معجزے سے خالی تہذیبیں، اپنے اپنے سیاق میں، اپنی اپنی انفرادیت اور جداگانہ تاریخ بھی رکھتی ہیں، اور سب کی تاریخیں ابھی مرتب بھی نہیں ہوئیں، مگر یہ سب انسانی احترام کی مستحق ہیں، اور دوسری تہذیبوں سے مکالمے، اشتراک، استفادے کے امکانات کی حامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہم اس بات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ خود ان چھوٹی بڑی تہذیبوں میں داخلی سطح پر وہ تعبیری کش مکش (interpretative contest) بھی موجود ہوتی ہے، جس میں شناخت کی سیاست کار فرما ہوتی ہے، خود اپنے جغرافیے میں موجود کسی گروہ کو غیر تصوّر کیا جاتا ہے، اس کا سٹیریو ٹائپ خلق کیا جاتا ہے، یعنی اسے وجود سے تہی، محض ایک تصوّر سمجھ کر، اس کو شناخت کے مرکزی دھارے سے نکال دیا جاتا ہے، اور اسے، بنیادی حقوق و مراعات سے محروم رکھا جاتا ہے، نیز تضحیک و رسوائی ہی نہیں حقیقی تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ شناخت کی اس سیاست کا رخ کئی بار باہر بھی ہوتا ہے، دوسری اقوام کی طرف بھی۔ سادہ لفظوں میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر قوم و تہذیب میں، تعریفوں پر اجارے کی کوشش موجود ہوا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ، کسی نہ کسی بنیاد پر ہوا کرتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے انسانی گروہ کو جغرافیہ ہی نہیں، ایک نظریاتی زمین (ideological land) بھی درکار ہوتی ہے۔ کئی لوگوں کے لیے اس سچائی کا بوجھ اٹھانا مشکل ہوتا ہے کہ ہر 'نظریاتی زمین' ایک تشکیل ہے؛ تاریخی یادوں، تجربوں اور مستقبل سے متعلق آدرشوں کی یک جائی پر مبنی تشکیل۔ اس تشکیل میں کوئی مقتدرہ شامل نہ بھی ہو تو اس پر اجارہ حاصل کر لیا کرتی ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ ہر انسانی گروہ، قبیلے، قوم، تہذیب میں ایک داخلی استعماریت کار فرما ہوتی ہے، اور اس کا جواز، مذکورہ 'نظریاتی زمین' سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اس نظریاتی زمین کو کئی بار ایک مابعد الطبیعیاتی تقدس عطا کر دیا جاتا ہے تاکہ اسے متنازع ہونے سے بچایا جا سکے۔ یعنی اسے سوال، بحث مباحثے کی حدود سے ماورا تصوّر کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ اقدام نظریاتی زمین کی تعریف پر کسی بھی مقتدرہ کے اجارے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ یہیں دانش وروں کے لیے لازم ہو جایا کرتا ہے کہ وہ ہر تعریف، ہر تعبیر کا تنقیدی جائزہ لیں اور داخلی استعماریت کی کوششوں، صورتوں اور تدبیروں کو بے رحمی سے آشکار کریں۔ اس کے ساتھ انھیں لوگوں کو ان قومی و عالمی اخلاقی و جمالیاتی اقدار کی طرف مسلسل متوجہ رکھنا چاہیے جنھیں مقامی یا بیرونی مقتدرہ یا دونوں مل کر پامال کرتی ہیں، مگر جن کے بغیر تہذیب اپنے بہترین عناصر کو محفوظ رکھ سکتی ہے، نہ انھیں مسلسل نشو و نما دے سکتی ہے اور انسانی

تہذیب کو ایک عالمی دستر خوان کے طور پر پیش کر سکتی ہے!*

❁

بنیاد کے اس شمارے میں حسبِ روایت عالمی، کلاسیکی، روایتی، جدید، معاصر موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ ہم اس شمارے کا آغاز ڈاکٹر خورشید رضوی کے مقالے ''ادونیس-روایت سے جدیدیت تک'' سے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے عہد کے سربر آوردہ عالم اور شاعر ہیں۔ وہ اردو کے ممتاز شاعر ہیں، تاہم ان کا اختصاص عربی ادبیات ہے۔ انھوں نے عہد جاہلیہ کے عربی ادب پر اردو میں یادگار تحقیقی کام کیا ہے۔ تاہم بنیاد کے لیے انھوں نے جدید عہد کے نام ور شامی شاعر ادونیس (جن کا اصل نام علی احمد سعید اسبر ہے) کی شاعری پر مقالہ مرحمت کیا ہے۔ یہ مقالہ، ادونیس کی شاعری کے مختلف ادوار، ان کی کلاسیکیت و جدیدیت سے وابستگی کا جائزہ لیتا ہے، اور محاکمہ کرتا ہے۔ اردو میں اس سے پہلے انور سن رائے (پ: ۱۹۴۹ء) نے ادونیس کی شاعری کے اردو تراجم کیے ہیں مگر ان پر پہلا مفصل مقالہ ڈاکٹر خورشید رضوی نے رقم کیا ہے، جسے ہم فخر کے ساتھ بنیاد میں شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے وہ دیگر جدید عربی شعرا پر بھی ہمیں اپنے مقالات عطا کریں گے۔

ہم ہر بار اردو کی کلاسیکی روایت پر کچھ مقالات شائع کرتے ہیں۔ اس بار لغت کے حوالے سے دو نئے مقالات شائع کر رہے ہیں۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا ہے۔ لسانیات، ان کا میدانِ خاص ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے لسانی نظریات، اردو زبان اور لغت پر کئی کتب شائع کی ہیں۔ اس بار انھوں نے داغ دہلوی کے شاگرد احسن مارہروی کی فصیح اللغات کا تفصیلی تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اردو کی یہ اہم لغت ابھی تک تفصیلی تحقیقی مطالعے سے محروم تھی۔ اس کا اختصاص یہ ہے کہ اسے داغ دہلوی کے کلام کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ تمام اسناد داغ سے لی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خصوصی مقالے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے خود لغت نویسی کے اصول و معیارات کو بھی پیش کیا ہے، جنھیں اردو کی اکثر لغات میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وصی اللہ کھوکھر نے متضاد الفاظ کا لسانیاتی و معنوی تجزیہ کیا ہے۔ زبان میں متضاد الفاظ کیوں کر قائم ہوتے ہیں، اور ان کی کتنی اقسام ہیں، اور ابلاغ میں ان کا کیا کردار ہوتا ہے، اس ضمن میں کئی بنیادی باتیں اس مقالے میں پیش ہوئی ہیں۔

گرمانی مرکز، لمز، جہاں سے بنیاد شائع ہوتا ہے، اس کے تحت حال ہی میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی کتاب: جنوب ایشیائی مسلمانوں کی غرب شناسی شائع ہوئی ہے۔ جن دنوں شعبۂ اشاعت، اس مسودے پر کام کر رہا تھا، خیال آیا کہ کیوں نہ اس بار بنیاد میں اسی موضوع پر ایک گوشہ بھی ترتیب دیا جائے۔ چناں چہ اہل قلم کو اس موضوع پر مقالات لکھنے کی دعوت دی گئی۔ ہمیں کوئی درجن کے قریب، اس موضوع پر مقالات ملے، مگر ہم محض تین کا انتخاب کر سکے۔ سچ بات یہ ہے کہ اردو میں ابھی غرب شناسی سے

متعلق ابہام پایا جاتا ہے۔ ہم نے اس بار اداریے کا موضوع بھی یہی بنایا ہے۔ یہ تین مقالات، مغرب کو موضوع ضرور بناتے ہیں، مگر غرب شناسی کو نہیں۔ تاہم ان تینوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ ممتاز ہندوستانی نقاد ڈاکٹر شافع قدوائی کا مقالہ، غالب شناسی، ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی اور نو آبادیات تینوں کو سمجھنے میں اہم ہے۔ غالب ۱۸۵۷ء کے گواہ ہی نہیں تھے، اس سے متاثر ہونے والوں میں شامل تھے۔ اپنے اردو خطوط، اشعار اور فارسی روزنامچے دستنبو میں اس جنگ آزادی کو لکھا۔ شافع صاحب نے دستنبو کا گہرا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے، اور ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ دستنبو کے متن کے ذریعے ہندوستانی تاریخ وسیاست اور ادب کی حقیقی صورتِ حال کی غیر معمولی آگاہی دیتا ہے۔ ساجد صدیق نظامی نے ایک محقق کے طور پر اپنی شناخت مستحکم کرلی ہے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء ہی کو موضوع بنایا ہے۔ ایک نایاب تاریخی دستاویز ڈھونڈ نکالی ہے، جس کے مصنف صوبیدار شیخ ہدایت علی تھے۔ یہ دستاویز، جنگ آزادی کو ایک دوسرے تناظر میں دیکھنے کا موقع دیتی ہے۔ یہ تناظر نو آبادیات کی حمایت کا ہے۔ ساجد صاحب نے اس دستاویز کا مختصر تجزیہ بھی کیا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر محمد نصر اللہ کا ہے۔ انھوں نے اردو افسانے کے اہم نفسیاتی مطالعات کیے ہیں۔ اس بار انھوں نے اردو افسانے میں اینگلو انڈین کرداروں کا تجزیہ کیا ہے۔ اردو افسانے کا یہ موضوع اب تک نقادوں کی توجہ سے محروم تھا۔ اردو افسانے کے سنہری دور (۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۰ء) میں شاید ہی کوئی افسانہ نگار ہو، جس کے یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کرداروں کے علاوہ اینگلو انڈین کردار موجود نہ ہوں، مگر بعد میں یہ کردار اردو افسانے میں کم ہوتے ہوتے غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر نصر اللہ نے نہ صرف اینگلو انڈین طبقے کی تاریخ بیان کی ہے، تاریخ میں اس طبقے کے حاشیائی مقام اور پھر تاریخ سے غائب ہونے کا ذکر کیا ہے، بلکہ اردو افسانے میں یہ کس کس ڈھنگ، کس کس عمل و خصوصیت کے ساتھ آئے ہیں، ان کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ اردو افسانے کا نیا مگر بے حد اہم مطالعہ ہے۔

دو سال پہلے بنیاد کے انھی صفحات پر جغرافی تنقید کا نظریہ متعارف کروایا گیا تھا۔ ہمارے لیے یہ امر باعث تشکر ہے کہ اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے۔ نہ صرف جامعاتی سطح پر اس موضوع پر مقالات لکھے گئے ہیں، اور لکھے جا رہے ہیں، بلکہ اس نظریے کی کئی اصطلاحات: جیسے جغرافیہ، ذہنی جغرافیہ، مکانیت، مکانی استعارہ، مادی، سماجی، تخیلی جگہیں اور مقامات اردو تنقید کے عمومی محاورے میں شامل ہو گئی ہیں۔ اس بار ہمیں شائستہ حسن اور محمد عامر سہیل نے اس موضوع پر دو اہم مقالات عنایت کیے ہیں۔ شائستہ حسن نے غالب کی شاعری میں گھر کے تصوّر کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ گھر بطور مادی جگہ اور بطور استعارہ، ان دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ ہمارے قارئین اس مقالے کے مطالعے سے محسوس کریں گے کہ غالب کی شاعری میں خصوصی طور پر اور شاعری میں عمومی طور پر گھر کو اس نظر سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ عامر سہیل نے دشت کو موضوع بنایا ہے۔ دشت، کلاسیکی شاعری کا ایک اہم استعارہ ہے۔ اسے اس مقالے میں بطور مکاں اور مکانی استعارے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ دشت و شہر، اور دشت و جنوں کے تعلق کو گہری نظر سے دیکھا گیا ہے۔ قارئین اس

مقالے کے مطالعے سے بھی محسوس کریں گے کہ کلاسیکی شاعری میں، دشت محض جنوں کا مقام نہیں، ایک علامتی، تخیلی مقام بھی ہے۔

بنیاد، ماحولیاتی تنقید پر باقاعدگی سے مقالات شائع کر رہا ہے۔ اس بار، اس موضوع پر دو مقالات شامل ہیں۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی نے اردو شاعری میں حیوانات کی نمائندگی کے طریقوں کو موضوع بنایا ہے۔ وہ اس مؤقف کو پیش کرتے ہیں کہ شاعری میں حیوانات کے سٹیریو ٹائپ ملتے ہیں۔ حیوانات کو بطور ایک زندہ وجود نہیں، انسانی شرف کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور نچلے درجے کی مخلوق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ مستثنیات بھی ہیں، جن کا ذکر مقالے میں ہے۔ امتیاز انجم نے جدید اردو غزل میں درختوں کے نوحوں کو موضوع بنا کر ایک اچھا مطالعہ پیش کیا ہے۔ مشتاق احمد خاں نے ناصر کاظمی کی پہلی بارش کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی نے پہلی بارش کی کچھ غزلیں، نیا دور میں شائع کروائی تھیں، جن میں کئی اشعار ترک کر دیے، کچھ میں تبدیلی و ترمیم کی۔ مشتاق خاں نے نہ صرف پہلی بارش کی تخلیق و اشاعت کی تحقیقی روداد لکھی ہے، بلکہ اس سوال کا جائزہ بھی لیا ہے کہ شاعر اپنے ہی کلام میں ترمیم و اضافہ کرتے ہوئے یا کلام ترک کرتے ہوئے، کس تنقیدی معیار کو پیش نظر رکھتا ہے، اور اردو ادب میں اس نوع کی دیگر ممتاز مثالیں کیا ہیں؟

عرفان حیدر نے فارینہ میر کے ایک اہم انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ کیا ہے، اس پر تبصرہ کیا اور عمدہ حواشی لکھے ہیں۔ اس مقالے کا موضوع اردو کا اخلاقی ادب ہے، جسے نو آبادیاتی ہندوستان کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں اردو کے اخلاقی ادب کی صنف کا جہاں تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے، وہیں اس ادب میں مُسلم فکر میں موجود تنوّع کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اردو کے اس اخلاقی ادب کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس میں ظاہر ہونے والی مسلم فکر، نو آبادیاتی ہندوستان کی روایتی مسلم قوم پرستی سے جدا ہے۔ فارینہ میر محققین کی اس نئی نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو خاموشی سے مگر فکر و تحقیق کی غیر معمولی قوت سے ہندوستان، اردو ادب، نو آبادیات، مسلم قومیت سے متعلق 'نیا علم' پیدا کر رہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اُردو دنیا کو ایک اہم مصنفہ اور ان کے بصیرت افروز مقالے سے روشناس کروا رہے ہیں۔ عرفان حیدر نے سخت محنت اور لیاقت سے یہ ترجمہ کیا ہے۔

بنیاد میں ہر بار ممتاز محققوں اور نقادوں کے ساتھ نئے، نوجوان لکھنے والوں کے مقالات بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس بار تین نئے لکھنے والوں کی تحریریں پہلی بار بنیاد میں شائع ہو رہی ہیں۔ مشتاق احمد خاں، محمد عامر سہیل اور امتیاز انجم۔ ہم امید کرتے ہیں کہ نئے لکھنے والے، اردو تنقید و تحقیق کی روایت میں اہم حصہ ڈالیں گے۔

❁

مصنوعی ذہانت نے قلیل عرصے میں جنگوں کی ٹیکنالوجی سے لے کر روزمرہ زندگی کے امور اور تخلیق و تصنیف اور

تحقیق و تنقید پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی اہمیت، اثر، امکان، خطرات اور چیلنج کو محسوس کرتے ہوئے، ہم نے بنیاد کی 'مصنوعی ذہانت کی پالیسی' تشکیل دی ہے، جسے اس جریدے کی ویب گاہ پر شائع کر دیا گیا ہے، اور اختصار کے ساتھ، بنیاد کے پرنٹ ایڈیشن میں بھی اسے شامل کیا جارہا ہے۔ ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس بار ہمیں نصف درجن کے قریب ایسے مقالات حاصل ہوئے، جن میں کلی یا جزوی طور پر مصنوعی ذہانت پر انحصار کیا گیا تھا۔ اردو میں مصنوعی ذہانت سے استفادے کو جانچنے کا کوئی تکنیکی نظام موجود نہیں ہے مگر کسی بھی تحریر کے گہرے مطالعے سے، اس کی زبان، دلائل، حوالوں، اقتباسات کے مفصل جائزے سے، انسانی اور مشینی اندازِ تحریر کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہم نے ان سب مقالات کی اشاعت سے گریز کیا ہے، جن میں مصنوعی ذہانت پر کلی یا جزوی انحصار کیا گیا تھا، کہیں متون کا تجزیہ کروایا گیا، کہیں زبان درست کروائی گئی، کہیں، محض پرامپٹ دے کر پورا مقالہ لکھوایا گیا، اور مقالے میں کسی مقام پر مصنوعی ذہانت پر انحصار کا اعتراف بھی نہیں کیا گیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز مصنفین، آئندہ مصنوعی ذہانت کی پالیسی کو پیش نظر رکھیں گے۔ ہم اس نئی ٹیکنالوجی کے مخالف نہیں، مگر اس سے استفادے کی حدود کو واضح رکھنے کے حق میں ہیں۔

❋

گزشتہ برس (جولائی ۲۰۲۵ء تا جون ۲۰۲۶ء) بھی کئی اہم ہستیاں ہم سے بچھڑ گئیں۔ اردو کے جواں سال مقبول شاعر تیمور حسن تیمور ۲۱ جولائی ۲۰۲۶ء کو وفات پاگئے۔ وہ غزل لکھنے اور مشاعروں میں پڑھنے کا منفرد انداز رکھتے تھے۔ ستیہ پال آنند گزشتہ برس اگست ۲۰۲۵ء کو دنیا سے گزر گئے۔ وہ پنجابی، اردو، ہندی اور انگریزی میں لکھتے تھے۔ ان کا آبائی وطن کوٹ سارنگ، ضلع چکوال تھا۔ ان کا مستقل قیام امریکا میں تھا۔ ممتاز ماہر تعلیم اور ترقی پسند خیالات کی حامل مقبول عام ڈاکٹر عارفہ سیّدہ زہرا، ۱۰ نومبر ۲۰۲۵ء کو انتقال کر گئیں۔ وہ تاریخ کی استاد تھیں، اور پاکستان کی تاریخ کے آمروں کی کڑی نقاد تھیں۔ نومبر ہی میں عرفان صدیقی راہی عدم ہوئے۔ وہ معروف کالم نگار اور شاعر تھے۔ انھوں نے وفاقی وزیر قومی تاریخ و ادبی ورثہ کی حیثیت سے علمی و ادبی اداروں کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ۲۸ مئی ۲۰۲۶ء کو اردو کے مقبول ترین شاعر بشیر بدر کا انتقال ہوا۔ وہ ہندوستان و پاکستان میں یکساں مقبول تھے۔ ان کے متعدد اشعار، زبانِ زد عام ہیں۔ براہوی زبان کے شاعر، ادیب اور استاد پروفیسر غمخوار حیات کا انتقال ۱۶ مئی ۲۰۲۶ء کو ہوا۔ انھیں قتل کیا گیا۔ ادارہ بنیاد ان سب کے لواحقین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ناصر عباس نیّر

۱۳ جون، ۲۰۲۶ء

*** کتبِ استفادہ:**

ایڈورسعید[Edward W. Said]، *Orientalism*(لندن: پینگوئین بکس، ۱۹۹۴ء[۱۹۷۸ء])۔

آئن بروما[Ian Buruma]، اویشائی مارگلٹ[Avishai Margalit]، *Occidentalism: A Short History of Anti-Westernism*(اٹلانٹک بکس، ۲۰۰۵ء)۔

آئن بروما[Ian Buruma]، اویشائی مارگلٹ[Avishai Margalit]، *Occidentalism: The West in the Eyes of its Enemies* (نیو دہلی: پینگوئن بکس، ۲۰۰۴ء)۔

جیمز جی کیریئر[James G. Carrier]، *Occidentalism, Images of the West*(نیویارک: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)۔

حسن حنفی، "From Orientalims to Occidentalism"، مشمولہ *Studia Philosophiae Christianae*(وارسا: یونیورسٹی آف پولینڈ، ۲۰۰۴ء)۔

حسن حنفی، مقدمہ فی علم الاستغراب (قاہرہ: الدار لفنیہ، ۱۹۹۱ء)۔

زاحیہ صالحی[Zahia Smail Salhi]، *Occidentalism: Literary Representations of the Maghrebi Experience of the East-West Encounter*(ایڈن برگ یونیورسٹی پریس، ۲۰۲۱ء)۔

زاحیہ صالحی، "The Maghreb and the Occident. Towards of the construction of an Occidentalist Discourse"، مشمولہ *Occidentalism Literary Representations of the Maghrebi Experience of the East-West Encounter* (ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۹ء)۔

منگ منگ وانگ[Mingming Wang]، *The West as the Other: A Genealogy of Chinese Occidentalism*(دی چائنیز یونیورسٹی آف ہانگ کانگ، ۲۰۱۴ء)۔

میکا ناتف[Mika Natif]، *Mughal Occidentalism, Artsitic Encounters between Europe and Asia at the Courts of India 1580-1630* (برل: لیڈن، ۲۰۱۸ء)۔

ولیم مونٹ گمری واٹ[William Montgomery Watt]، *The Influence of Islam on Medieval Europe*(۱۹۷۲ء)۔